عربی مطبوعات

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

[عربی مطبوعات پر تبصرے کی یہ دوسری قسط ہے، جو قدرے دیر سے شائع ہو رہی ہے۔ درمیان میں ایک صحبت، اخبار اور رسالوں کی نذر ہو گئی۔ اللہ نے چاہا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ پچھلی مرتبہ ہم نے صرف ایسی کتابیں منتخب کی تھیں، جو موجودہ تقاضوں کے مطابق اور ایک دوسرے کے ساتھ فکری لحاظ سے ہم آہنگ بھی تھیں۔ اب کے موضوع میں تنوع کا خیال رہا ہے۔ اور بعض خالص ادبی چیزوں کا بھی تعارف کرایا جا رہا ہے۔

"عربی مطبوعات" کا دائرہ مصر تک محدود نہیں، لیکن اسلامی فکر و نظر میں جو تجدید و انقلاب پیدا ہو رہا ہے اس کا مرکز مصر ہی ہے، اس لیے ہمارے مطلب کی کتابیں زیادہ تر مصر ہی سے نکلتی ہیں، اور یوں بھی مصر عربستان کا علمی و ادبی مرکز ہے۔ پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ ایک آدھ ہی کتاب سے سہی، عربستان کے دوسرے حصوں کی بھی نمائندگی ہو جائے۔

ان تبصروں سے عربی مطبوعات کی رفتار کا ہلکا سا اندازہ ہو گا۔ اس لیے کہ اولاً تو تمام اچھی کتابیں کوشش کے باوجود ہم تک بروقت نہیں پہنچتیں۔ دوسرے ایک ماہانہ رسالے کے محدود صفحات میں، ایک دوسری زندہ زبان کے مطبوعات کا مکمل جائزہ لینا تقریباً ناممکن سا ہے۔ م۔ ع]

(۱) رسائل الرافعی (رافعی کے خطوط) مرتبہ: محمود ابوریہ۔ بڑی تقطیع کے ۳۰۰ صفحے، کاغذ اور طباعت اعلیٰ۔ مطبوعہ، قاہرہ ۱۳۶۹ھ۔

یہ مصطفیٰ صادق رافعی مرحوم (ف ۱۹۳۷ء) کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد اور معتقد محمود ابوریہ کو بیس بائیس برس کے عرصے (۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۴ء) میں لکھے تھے۔ عربی ادب کے شیدائیوں

پر عموماً اور رافعی کے عاشقوں پر خصوصاً محمود ابوریہ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ادب و بلاغت کا یہ خزانہ وقفِ عام کر دیا۔ رافعی اس دور میں عربی زبان و ادب کے امام اور مجدد تھے۔ اس میں کوئی بدذوق ہی شک کر سکتا ہے۔ سید جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد اور دنیائے اسلام کے مشہور سیاسی لیڈر امیر البیان امیر شکیب ارسلان کا مشہور فقرہ ہے: لم تنجب العرب مثله منذ مئات من السنين (سرزمین عرب صدیوں سے ان کا مثل نہیں پیدا کر سکی)۔ بلاغت و معنی آفرینی میں حد اعجاز تک پہنچنے کے ساتھ، رافعی دین کا بڑا درد رکھتے تھے۔ ان کی ساری عمر لڑائی میں گذری۔ مصر کا کوئی "جاہل" ادیب نہیں جس نے ایک آدھ بار ان سے ٹکر لی ہو اور منہ کی نہ کھائی ہو۔ طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد خاص طور پر ان کے غیظ و غضب کا شکار ہوئے۔ طٰہٰ حسین اپنے الحاد و زندقہ کی وجہ سے اور عباس محمود العقاد اپنی بے اصولی اور بے راہ روی کے باعث۔ سلامہ موسیٰ جیسے چھوٹے موٹے ملحدوں کا تو ذکر ہی کیا، یہ "جہل مرکب" کے پتلے تو رافعی کے ایک آدھ حملے کی بھی تاب نہ لا سکے۔ مگر رافعی انسان تھے اور ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ وہ کبھی حق کے لیے بپھرتے تھے اور کبھی اپنی خودی کی مدافعت میں۔ طٰہٰ حسین پر ان کے حملے صرف حق کی خاطر تھے اس لیے وہ بہت مؤثر اور کامیاب رہے۔ تحت رایۃ القرآن ان حملوں کی تاریخی یادگار ہے۔ عقاد پر ان کے حملے ذاتیات سے ملوث ہو گئے تھے، اس لیے ان میں وہ شان قائم نہ رہ سکی۔ رافعی کے ادب کی ایک اور شاخ ہے جو بہت مبہم اور بھول بھلیاں کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سلسلے کی کتابیں حدیث القمر، السحاب الاحمر، رسائل الاحزان اور اوراق الورد ہیں۔ ان کے پڑھنے سے پہلے ان کا پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ رافعی کے ہونہار اور وفادار شاگرد محمد سعید العریان نے حیاۃ الرافعی لکھ کر یہ کمی بڑی حد تک پوری کر دی ہے۔ اور جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ مکاتیب کے زیر نظر مجموعے سے پوری ہو جاتی ہے۔ اگر رافعی کے پڑھنے سے پہلے یہ دونوں کتابیں پڑھ لی جائیں، تو رافعی کا ابہام دور ہو جاتے اور ان کی تلمیحات کا عقدہ بھی کھل جائے۔

ان خطوط کے مخاطب اور جامع محمود ابوریہ ایک مشہور عالم اور کامیاب ادیب ہیں۔ خطوط کا مجموعہ انہوں نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ آغاز میں مرتب کے قلم سے ایک دل آویز مقدمہ ہے (کیف عرفت مصطفیٰ الرافعی؟) اس کے بعد امیر شکیب ارسلان کی ایک پرانی تحریر بطور تعارف کے درج

کی گئی ہے۔ جس میں انہوں نے ایک مستفسر (مرتب رسائل) کو رافعی کی کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ دونوں مقدمے دلچسپ اور تسکین ذوق کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ آخر میں اشاریہ اور جا بجا توضیحی حاشیے بھی ہیں۔ اس بیش بہا تحفے پر قدر دانان رافعی کی طرف سے ہم مرتب کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ہمارے ملک کے عام عربی داں یا عربی خواں نئی اور پرانی عربی کا فرق کرتے ہیں، حالانکہ عربی وہی ہے۔ قدیم وجدید کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔ اردو میں بھی پرتاپ اور ملاپ کی زبان نمونے کے طور پر نہیں پیش کی جاتی۔ آپ رافعی، امیر شکیب ارسلان، محمد کرد علی، عبد القادر مغربی، سید رشید رضا کو پڑھیں گے تو محسوس کریں گے کہ وہی مضر و عدنان کی زبان ہے۔ اور عصر حاضر کے یہ انشا پرداز دور عباسی کے اچھے سے اچھے انشا پردازوں سے کسی طرح کم نہیں۔ البتہ نئی ایجادوں اور نئے معانی کے لیے نئے الفاظ اور اصطلاحوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ دور عباسی میں بھی ہزاروں ایسے الفاظ پیدا ہوتے، جو جاہلی اور اموی عہد میں نہیں تھے اور انہیں آپ پرانی عربی ہی سمجھتے ہیں ——— بات تبصرہ کے حدود سے بڑھ نکلی۔ کہنا یہ تھا کہ جدید رجحانات (نہ کہ جدید عربی) سے واقفیت کے لیے رافعی کا مطالعہ ضروری ہے اور اس مطالعے میں حیاۃ الرافعی کے ساتھ زیر نظر کتاب رسائل الرافعی سے بھی مدد ملے گی۔ ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

(۲) ذکری الامیر شکیب ارسلان (امیر شکیب ارسلان کی یاد)۔ مرتبہ: محمد علی الطاہر تقطیع متوسط، ۵۲۶ صفحے۔ طباعت اچھی۔ کاغذ معمولی۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء۔

سید جمال الدین افغانیؒ کے شاگرد اور ان کے طریق فکر و عمل کے داعی، امیر شکیب ارسلان سے کون واقف نہیں؟ ساری عمر علمی و عملی جدوجہد میں بسر ہوئی۔ عربی کا تو کیا کہنا، کہ یہ دور حاضر میں عربی زبان و ادب کے امام تھے۔ خود تو یہ رافعی کی امامت کے قائل تھے، مگر راقم کی نگاہ میں دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ اس کے علاوہ ترکی اور فرنچ کے بھی ماہر اور باکمال انشا پرداز تھے۔ جرمن اور دوسری یوروپی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ لبنان کے ایک خوش حال اور خاندانی امراء کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آل ارسلان اسلامی تاریخ کے ہر دور میں سیف و قلم کے مالک رہے ہیں۔ گھرانے کی روایات کے مطابق جلدی ہی عربی نثر نگاری

اور شاعری میں اچھی جگہ پیدا کرلی پھر سیاسیات میں دلچسپی لی تو عثمانی حکومت کے چوٹی کے اہل سیاست میں شمار ہونے لگا۔ بزم کے ساتھ رزم کے بھی مرد میدان تھے۔ طرابلس میں اپنے خاص دوست انور مرحوم کے ساتھ خوب خوب مردانگی کے جوہر دکھائے۔ پہلی بڑی لڑائی کے خاتمے پر عرب لبنان کی سرزمین ان پر "حرام" قرار دے دی گئی برطانیہ، فرانس، اٹلی، کوئی بھی انہیں برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے عمر کے آخری تیس سال جلا وطنی میں گذرے۔ حرم اسلام (حجاز) اور حرم مغرب (سوئٹزرلینڈ) کے سوا کہیں انہیں امن نہیں ملتا تھا، مگر یہ اللہ کا مجاہد بندہ تمام مشکلات کے باوجود اپنے کام میں لگا رہا۔ دوسری بڑی لڑائی کے ختم ہوتے ہی لبنان کی جمہوریت نے آزادی کا سانس لیا، تو وطن مالوف کو واپس ہوئے، لیکن قسمت میں وطن کی صرف مٹی ہی لکھی تھی تھوڑے عرصہ کے بعد دار آخرت کی راہ لی (دسمبر ۱۹۴۶ء)

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے امیر شکیب ارسلان کی طویل اور دکھ سکھ سے بھری ہوئی زندگی کا محمد علی الطاہر نے ان کی یادگار میں مقالات اور منظومات کا یہ ضخیم مجموعہ شائع کرکے بڑا کام کیا ہے۔ عرب ملکوں میں ہمارے ہاں سے وفا شعاری زیادہ ہے۔ خود امیر شکیب ارسلان، وفا شعاروں کے امام (امام الاوفیاء) کہے جاسکتے ہیں۔ سید رشید رضا اور احمد شوقی بک پر امیر البیان کی تصنیفات جن لوگوں نے پڑھی ہیں، وہ راقم کی اس رائے سے اتفاق کریں گے[1]۔ محمد علی الطاہر، امیر سے خاص محبت رکھتے ہیں۔ زندگی بھر ان کا دم بھرتے رہے اور مرنے کے بعد بھی ارمغانِ عقیدت پیش کرنے میں پیش قدمی کی۔

مجموعہ کے مرتب محمد علی الطاہر ایک فلسطینی مجاہد اور بے باک صحافی ہیں۔ زبان و ادب میں تو ان کا کوئی خاص مقام نہیں، مگر حق گوئی اور بے باکی میں وہ اپنی آپ مثال ہیں۔ ان کے "الشوریٰ" اور "الشباب" کے جرأت آموز مقالات کی یاد اب تک دلوں سے محو نہیں ہوئی۔ اس مجموعہ میں انہوں نے کوئی خاص ترتیب ملحوظ نہیں رکھی۔ وفات کی خبر سے لے کر کتاب کی طباعت تک عربی اخبارات اور تعزیتی جلسوں میں جو کچھ

---

[1] ان سطروں کے لکھنے کے بعد زیر نظر مجموعہ کی دوبارہ ورق گردانی کر رہا تھا کہ سید رشید رضا مرحوم کے صاحبزادے سید معتصم رضا کے قلم سے ایک مختصر مضمون نظر سے گذرا جس میں انہوں نے امیر کو "امیر الاوفیاء" (وفا شعاروں کے سردار) کے لقب سے یاد کیا ہے۔ توارد خیال اسی کو کہتے ہیں۔

لکھا اور کہا گیا ہے، وہ سب اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔ تعزیت کے تاروں سے لے کر طویل مقالات اور پرسوز مرثیے تک، سب کچھ اس میں موجود ہیں۔ بعض بعض مرثیے بہت موثر اور پُر درد ہیں۔ یوں تو شبلی ملاط کے مرثیے کی داد خود صدر جمہوریہ[1] نے نظم ختم کرتے ہی ٹیلیفون سے دی تھی[2]۔ مجموعے میں ایک موثر مرثیہ استاذ محترم ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے نزاوش فکر کا نتیجہ بھی ہے، لیکن راقم کو مراکش کے مشہور لیڈر محمد علال الفاسی کے مرثیے نے جتنا متاثر کیا، اتنا اس مجموعے کی کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ علال کو امیرالبیان مانتے بھی بہت تھے" دل را بدل رہیست" شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے۔

مجموعہ میں کچھ" چوٹیں" بھی ہیں اور محمد علی الطاہر کی کسی کتاب کا ان سے خالی ہونا ناممکن ہے عبدالرحمٰن عزام (جن کی امیر نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی) نے خود کسی تعزیتی جلسے کا نظم نہیں کیا، اور نہ ان کے بلائے ہوئے جلسے میں خاص حصہ لیا۔ اس پر محمد علی الطاہر کو بڑا غصہ آیا ہے اور اپنی روائتی بے باکی کے مطابق کچھ" اسرار درونِ پردہ" فاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیرِ نظر مجموعہ ایک ادبی کشکول ہے۔ عدن سے لے کر جنوبی امریکہ تک، ہر جگہ کے عربی شاعر یہاں جمع ہیں۔ درمیان میں امیر کی زندگی کی مناسبت سے سیاسی معلومات بھی کافی آگئے ہیں شائقین ادب کے لیے دلچسپی کی چیز ہے۔

(۳) مشاهداتي في جزيرة العرب۔ (جزیرہ عرب میں میرے مشاہدات) مصنف احمد حسین بڑی تقطیع، ۳۶۸ صفحے۔ طباعت اعلیٰ۔ کاغذ غنیمت۔ مطبوعہ قاہرہ سنہ ۱۹۵۰ء۔

---

[1] صدر جمہوریہ بشارہ خوری کے والد خلیل خوری سے امیرالبیان کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ ہمیشہ امیر کے ممنونِ کرم رہے۔ اسی احسان شناسی کے جذبے کے ماتحت صدر جمہوریہ نے امیر کی واپسی کی جان توڑ کوشش کی اور وفات پر تعزیت و جلوس کے انتظامات سے خاص دلچسپی لی۔ واضح رہے کہ صدر جمہوریہ عیسائی اور خود بھی عربی کے اچھے ادیب ہیں۔

[2] شبلی ملاط، لبنان کے مشہور عیسائی شاعر ہیں۔ بیروت کے ریڈیو اسٹیشن سے مرثیہ سنانے کا ذکر ہے۔ وہ ابھی نظم ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ صدر جمہوریہ نے ٹیلیفون سے مبارک باد دی۔

یہ مصر کے اشتراکی لیڈر احمد حسین کا سفرنامہ حج ہے۔ اشتراکی، اور حج کے جوڑ سے آپ نہ گھبرائیں۔ احمد حسین صاحب مصر کی عملی سیاسیات میں ایک فعال حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلے یہ نیلی پوشوں کے قائد تھے اور ان پر نازیوں سے ساز باز کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اب یہ اشتراکیت (یعنی سوشلزم، شیوعیت یعنی کمیونزم نہیں) کے علم بردار ہیں۔ ۲۶ جنوری ۵۲ء کے تباہ کن فسادات کے سلسلے میں بھی یہ ماخوذ ہیں، بلکہ ماخوذین میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ اور جانے، کیا سزا ہو۔ پھانسی تک کا خطرہ ہے۔

احمد حسین نے چار مرتبہ حج کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ آخری حج کی روداد یا تاثرات ہیں۔ ان کو سمجھنے اور ان کے اصلی خیالات کا اندازہ لگانے کے لیے راقم نے یہ کتاب خاص طور پر منگوائی اور حرف بہ حرف پڑھی۔ میں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس میں کہیں سے نفاق یا بدعقیدگی کی پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ ایک مومن قانت کی طرح اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہیں۔ دلوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ ممکن ہے، یہ بھی ہمارے ملک کے بعض بھولے مسلمانوں کی طرح اسلام اور سوشلزم میں تضاد نہ محسوس کرتے ہوں۔ بہرحال اس سفرنامہ کی حد تک بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

سفرنامہ اچھا خاصہ ہے۔ حج کے بعد طائف، ریاض، اور ظہران کی بھی سیر کی اور یہ سب شاہی مہمان کی حیثیت سے اور بڑے آرام و آسائش کے ساتھ۔ واپسی بھی گراں قدر تحائف کے ساتھ ہوئی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اپنی بلند بانگ حریت اور دعویٰ اشتراکیت کے باوجود شخصی نظام حکومت کی خرابیاں دیکھتے ہیں اور دوٹوک بات نہیں کہتے۔ ایک آدھ بات نصیحت کی کرتے ہیں، تو چار باتیں تعریف و تحسین کی۔ پٹرول کے مرکز ظہران سے متعلق اچھی معلومات فراہم کی ہیں اور سعودی حکومت کو بھی امریکی خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے مناسب مشورے دیئے ہیں۔ مختلف مقامات و اشخاص کی تصویریں بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ یہ تو خیر اشتراکی ہیں، مصر کے علماء نے تصویر کے جواز پر گویا اتفاق کر رکھا ہے۔

بہرحال کتاب اچھی ہے، گو زبان عام اخباری سطح سے بلند نہیں۔ عام طور پر نئے لکھنے والے انگریزی اور فرنچ میں سوچتے ہیں، اس لیے اسالیب بیان اجنبی معلوم ہوتے ہیں اور طرز تحریر عربی ذوق پر گراں گذرتا ہے۔ مگر یہ بیماری ایسی عام ہے کہ معالج حیران ہیں اور علم بردارانِ تجدد تو اسے بیماری بھی تسلیم نہیں کرتے۔

(۴) معتقل هاکستیب (هاکستیب کیمپ جیل)۔ مولف: محمد علی الطاہر۔ تقطیع متوسط، ۶۸۰ صفحے۔ طباعت اچھی، کاغذ معمولی۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء۔

دسمبر ۴۸ء سے تقریباً ۴۹ء کے اواخر تک، مصر پر جو دور تشدد کا ایسا دور گزرا ہے، جس کی مثال مشکل ہی سے کہیں اور ملے گی۔ پرانے وفدیوں یا وفد کے باغیوں کی ایک شاخ عرصہ سے "السعدیون" (احمد زغلول کی نسبت سے) کے نام سے قائم ہے۔ اُن دنوں یہی پارٹی برسر اقتدار تھی، اور ان کے لیڈر محمود فہمی نقراشی وزیر اعظم تھے۔ انگریزوں کے اشارے بلکہ دباؤ سے نقراشی نے اخوان کو خلاف قانون قرار دے دیا[1] (۸ دسمبر ۴۸ء)۔ یہ نقراشی کی شرمناک غلطی تھی۔ اللہ کا کرنا یہ کہ کچھ ہی دنوں بعد ایک سرپھرے نوجوان نے ان کا کام تمام کر دیا، جس کا اخوان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نقراشی کے بعد ابراہیم عبدالہادی "سعدیون" کی قیادت اور وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔ نقراشی کی طرح یہ بھی برسوں وفد کے رکن رہ چکے ہیں۔ مگر نقراشی کی صلاحیتیں ان میں نہیں (ص ۴۳)۔ ان کا دور حکومت، مصر کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ اس عہد کا سب سے افسوسناک واقعہ مرحوم حسن البنا کی شہادت ہے، جس میں پولیس کے افسروں نے کھل کر حصہ لیا[2] (۱۲ فروری ۴۹ء)۔ اس کے بعد مصر میں وہ سب کچھ ہوا، جس پر دنیا کی وحشی ترین قومیں بھی شاید لعنت بھیجنے پر مجبور ہوں۔

زیر نظر کتاب میں اسی دور ظلمت و وحشت کا کچا چٹھا بیان کیا گیا ہے۔ یہ ابراہیم عبدالہادی اور اس کے اعوان و انصار کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ انہوں نے محمد علی الطاہر جیسے بے دھڑک آدمی کے قید کرنے کی حماقت کا ارتکاب کیا۔ الطاہر رہے تو جیل میں صرف اٹھارہ انیس روز (۲۴ جولائی ۴۹ء۔ ۱۲ اگست ۴۹ء) مگر اتنی سی مدت میں انہوں نے اور ان کے دوستوں نے ایک دنیا سر پر اٹھالی۔ اور رہائی کے بعد اس دور وحشت

[1] مصنف نے خود ابراہیم عبدالہادی کے دست راست عبدالرحمٰن عمار کی زبانی نقل کیا ہے کہ امریکا، انگلستان اور فرانس کے سفیروں نے متفقہ طور پر اخوان کو خلاف قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ (ص ۴۳)

[2] مصنف نے یہ الزام اور کھل کر عائد کیا ہے (ص ۴۴، ص ۱۰۳)

کی رسوائی کے لیے (جسے ہمارے دوست صالح عشماوی "عہد بداعمہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں) تقریباً آٹھ سو صفحوں کا یہ اعمال نامہ چھاپ کر شائع کر دیا، جو شاید اخوان نہ کر سکتے۔

محمد علی الطاہر کا اخوان سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ مغربی استعمار کے سخت دشمن ہیں، بلکہ وہ اپنے کو العدو الاول للاستعمار فی الشرق العربی (مشرقی عربستان میں امپریلزم کا دشمن نمبر ایک) کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کی اب تک کی زندگی اسی جدوجہد میں بسر ہوئی ہے۔ مصری پولیس کے بعض بڑے افسر، جو پرانے انگریز افسروں کی تربیت میں رہے ہیں، انہیں پسند نہیں کرتے۔ اور یہی ناپسندیدگی نظر بندی کا باعث ہوئی۔ اتفاق سے انہیں ہاکسٹیپ کیمپ جیل بھیج دیا گیا، جہاں اخوان کے کارکن بڑی تعداد میں محبوس تھے۔ اس کیمپ کی تاریخ یہ ہے کہ لڑائی کے دنوں میں، امریکا نے مصر کے جنگی علاقوں میں کچھ بارک بنائے تھے، جو بعد میں ہاکسٹیپ نامی ایک امریکی افسر کے نام سے مشہور ہوئے۔ جنگ [illegible] حکومت نے انہیں سستے داموں خرید لیا تھا اور ان کا سازوسامان بیچ کر نفع بھی کمایا تھا (ص [illegible]) پر مظالم کا سلسلہ شروع ہوا تو انہی شکستہ حال بارکوں کو کیمپ جیل بنا دیا گیا اور گرفتاران بلا تکلیف و مصیبت سہنے کے لیے اس میں چھوڑ دیے گئے۔ اس کتاب کے مولف جب وہاں پہنچے تو اخوانی نوجوانوں نے ان کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا اور یہ ان کے اخلاق و صبر و تحمل سے بہت متاثر ہوئے۔

بسم اللہ یا کسی تمہید و مقدمہ کے بغیر، کتاب کا آغاز یک لخت مولف کی گرفتاری کی خبر سے ہوتا ہے، جس کے نیچے الاہرام، ۲۴، جولائی ۱۹۴۹ء کا حوالہ درج ہے۔ سرخی بھی اسی مناسبت سے القصۃ من اولھا الی آخرھا (کہانی شروع سے آخر تک) جمائی ہے۔ اس کے بعد پھر سلسلۂ بیان شروع ہو گیا ہے، جسے پڑھ کر طبیعت حیران ہے کہ تبصرے کی محدود گنجائش میں کن کن چیزوں کی طرف اشارہ کیا جائے۔ مصنف کی فراہم کردہ معلومات بہت قیمتی ہیں۔ ان کے ذرائع معلومات بھی بہت وسیع ہیں۔ ان کی بے باکی اور جرأت ضرب المثل ہے۔ ابراہیم عبدالہادی اور اس کی مُقتیات کے تو (بلا مبالغہ) بخیے ادھیڑ دیئے ہیں۔ ساتھ ساتھ عرب لیگ کی بھی بُری طرح خبر لی ہے۔

فلسطین کے المیہ سے مصنف کا متاثر ہونا قدرتی بات ہے۔ خود فلسطین کے رہنے والے ہیں اور

پچیس تیس سال سے گھر بار چھوڑ کر اسی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ عرب لیگ اور عرب حکومتوں نے فلسطین کو بے دریغ اور سستے داموں فروخت کر دیا، تو بے قابو ہو جاتے ہیں اور عبدالرحمٰن عزام سے لے کر عبداللہ (شرق اردن) نوری السعید (عراق) اور جانے کس کس کے اسرارِ درونِ پردہ کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ اور تو اور مصنف کے دوست اور ہم وطن، ہمارے محبوب و محترم مفتی امین حسینی بھی ان کے حملوں سے نہیں بچ سکے ہیں۔ فلسطین کے سلسلے میں سعودی حکومت کے وزیر یوسف یاسین[1] کی بھی بڑی خبر لی ہے۔ یوسف یاسین اور لحاظ سے کیسے ہی خراب آدمی ہوں، مگر فلسطین کے سلسلے میں ان پر الزام عائد کرنا زیادتی ہے۔ ابن سعود حالات سے بے خبر نہیں۔ وہ اگر فلسطین کی مدد کرنا چاہتے تو بیچارے یوسف یاسین کی کیا مجال تھی کہ دخل اندازی کی جرأت کر سکتے۔ عراق اور نوری سعید کے نامۂ اعمال کے ساتھ ساتھ عراقی فوج کی شرافت کا بھی ایک نمونہ قابلِ دید ہے۔ نوری سعید کو تو مصنف "بلادِ عرب میں برطانیہ کے جنرل ہائی کمشنر" (المندوب السامی البریطانی العام فی بلاد العرب) کے "شاندار" لقب سے یاد کرتے ہیں۔ فلسطین کی تباہی اور عربوں کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، جب نوری سعید نے دیکھا کہ شام اور مصر کی فوجیں اسرائیل کے مقابلے سے نہیں ہٹتیں، تو شام کو عقب سے حملہ کی دھمکی دی اور عراق کی پوری فوج فلسطین سے واپس بلوالی، حالانکہ اس سے پہلے ہی وہ جہاد سے کنارہ کشی اور مصری فوج سے عدمِ تعاون کے احکام صادر کر چکا تھا (ص ۸۱-۸۰ ملخص)۔ اس کے بعد فوج کی شرافت کا ذکر ہے۔

معاذ اللہ عراقی فوج کے سپاہیوں اور افسروں کو زندہ رکھے۔ بیچارے فلسطین سے واپس ہو رہے تھے۔ اُن لشکریوں اور افسروں کی غیرت کی بھی داد دیجیے، جنہوں نے بغداد پہنچنے پر

[1] یوسف یاسین، علامہ سید رشید رضا مرحوم کے شاگرد اور ان کے بنائے ہوئے، آج کل سلطان ابن سعود کے مقربین خاص میں ہیں۔ اظاہر کو ان سے سید رشید مرحوم کی اولاد کے باب میں سخت شکایت ہے عرصہ تک انہوں نے سلطان کو سید رشید مرحوم کے خاندان کی مالی حالت کا پتہ ہی نہیں لگنے دیا۔ مدد تو کیا کرتے، اور رکاوٹیں ڈالیں۔ آخر امیر شکیب ارسلان مرحوم کے ایک خط سے سلطان ابن سعود کو سید رشید کے گھر کا حال معلوم ہوا۔ خود سید رشید کے صاحبزادے معتصم رضا نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے اس لیے وہ یوسف یاسین کی اس احسان فراموشی (ان کی زبان میں) کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں (ذکری الامیر شکیب، ص ۶-۲۸۵)

نوری سعید کے تمغے اور انعامات قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ بولے: ہم لڑے، نہ ہم نے کوئی کام کیا۔ یہ تمغے اور انعام کس چیز کے صلے میں؟"

اس سلسلے میں نوری سعید کے کارنامے سے متعلق دو فقرے اور سن لیجیے:۔

"غیر ملکی مبصرین (جو التوائے جنگ کے صدود کی نگہداشت کے لیے آئے ہوئے تھے) نے عراقی فوج کی واپسی کا نظارہ کیا، تو انہیں فوج کی تعداد اور ساز و سامان دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ کہتے تھے، یہ لوگ یہاں کیا کرتے رہے ہیں فلسطین کو یہود کے لیے خالی چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟

——— اس کا جواب میں عرض کرتا ہوں۔ عراقی فوج فلسطینیوں سے اسلحہ چھین کر، انہیں اسلحہ سمیت اردن کی انگلو ہاشمی حکومت کے سپرد کرنے گئی تھی، جس نے خود ہی انہیں یہود کے حوالہ کر دیا" ص ۸۱

فلسطین کے سلسلے میں مصنف نے جو کچھ معلومات فراہم کی ہیں، انہیں پڑھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ان چیزوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بغداد میں بھی ہر طرف یہی چرچا تھا۔ اب تفصیلات معلوم ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کوئی مصیبت بے وجہ نازل نہیں کرتا۔

اخوان پر مظالم کی جو لمبی اور لرزہ خیز روداد مصنف نے قلم بند کی ہے، انہیں پڑھ کر عقل انگشت بدنداں ہے۔ ایک مسلمان نام رکھنے والی حکومت، اسلام کا نام لینے والوں کے ساتھ ایسا شرمناک برتاؤ بھی کر سکتی ہے؟ اس پر بار بار حیرت ہوتی ہے۔ جیل اور قید کا ذکر نہیں۔ زدوکوب، معمولی معمولی بات پر پولیس کے ڈنڈوں سے ——— کالج کے طلبہ، ادیبوں، عالموں، وکیلوں اور اخبار نویسوں کے ساتھ یہ برتاؤ ہوا۔ اور بیچارے صبر و شکر کے ساتھ جھیل گئے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ ہمارے تو سن سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری اور ان کے رفقا کے ساتھ زدوکوب کے واقعات کا تذکرہ جب بھی نظر سے گذرتا تھا، تن بدن میں اک آگ سی لگ جاتی تھی۔ اب یہی کیفیت عبدالحکیم عابدین اور البہی الخولی جیسے نازک خیال ادیب اور صاحب فکر عالم کے ساتھ اس نارواں برتاؤ کا حال پڑھ کر طاری ہونے لگتی ہے۔ عبدالحکیم عابدین، اخوان کے جنرل سیکرٹری، حسن البنا مرحوم کے بہنوئی، اور ایک اچھے انشا پرداز اور شاعر ہیں۔ ۱۳ جولائی کو جب مصنف

جیل میں موجود تھے) انہیں ایک نوٹس ملا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ "ان کی رہائی کا کوئی سوال نہیں"۔ جیلر نے انہیں بلا کر کہا کہ اس پر "علیمہ" (اطلاع مل گئی) لکھ دو۔ عبدالحکیم نے ادبی اور معنی خیز انداز میں "علیمہ" کے بجائے "وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ" لکھ دیا بس پھر کیا تھا، اس "متمرد" کی سزا کا حکم صادر ہو گیا، جو ظالموں کو اللہ کی دھمکی دیتا ہے۔ اور بیچارے پر ڈنڈوں اور ہاتھوں سے اتنی بارش ہوئی کہ قریب المرگ ہو گئے (صفحہ ۱۵۶-۱۵۵)

البہی الخولی (جن کی کتاب تذکرۃ الدعاۃ پر اسی سلسلے میں تبصرہ کیا جا رہا ہے اور جن کے مضامین، قصص القرآن پر "المسلمون" میں مسلسل نکل رہے ہیں) کی روداد الم تو ایسی ہے کہ یہ گنہگار اپنی سنگ دلی اور الٹی سیدھی تاریخ نگاری کی مشق کے باوجود بیان کرنے سے قاصر ہے۔ جب پڑھتا ہوں اور لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں، تو دل بے قابو ہو جاتا ہے اور دست و قلم کی تھرتھراہٹ دیکھ کر آنکھیں ہمدردی پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ اللہ! ایک قرآن کا عالم، تذکرۃ الدعاۃ کا مصنف، اس پر گھنٹوں ننگا کر کے (آخر میں ایک مختصر سا جانگیہ چھوڑ دیا گیا تھا) ڈنڈوں نہیں بلکہ لوہے کی موٹی سلاخوں کی بارش ہو۔ اور پھر وزیر اعظم ابراہیم عبدالہادی آ کر تماشہ دیکھیں (صفحہ ۳۸۴) اس سے زیادہ شرمناک واقعہ سننے میں نہیں آیا۔ جرم، پوچھئے، تو کچھ بھی نہیں۔ صالح عشماوی، ابراہیم عبدالہادی کے عہد حکومت کو عہد ابراہہ کہتے ہیں۔ یہ اس کی بڑی عزت افزائی ہے۔ یہ پوری روداد خود البہی الخولی کے قلم سے "صوت الامۃ" میں شائع ہوئی تھی۔ مصنف نے اس کا خلاصہ دیا ہے، جو پورے چار صفحے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس زد و کوب کے دوران میں وہ بار بار بیہوش ہوئے اور سارا جسم خون سے لت پت تھا (صفحہ ۳۸۲-۳) ۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی زندگی منظور تھی، ورنہ ظالموں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ سچ کہا: "وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ"۔ —— یہ دو واقعے نمونے کے طور پر راقم نے بیان کئے ہیں، ورنہ بعض نوجوان کارکنوں کے گھر کی مستورات کے ساتھ بھی "بے عنوانیاں" کی گئیں۔ (صفحہ ۳۹۶) ۔ یہ سب کچھ ایک مسلمان بادشاہ کی مسلمان وزارت کی مسلمان پولیس کے ہاتھوں ہوا، فالی اللہ المشتکی۔

تبصرہ بہت طویل ہو گیا۔ اور قابل ذکر چیزیں بہت سی رہ گئیں۔ نگاہِ انتخاب بھی حیران رہ گئی، کیا بیان کرے، کیا چھوڑے؟ بہر حال محمد علی الطاہر کے جہاد مسلسل کی یہ بھی ایک کڑی ہے اور وہ اس پر مستحق مبارکباد ہیں۔

(۵) دلیل مؤرخ المغرب الاقصیٰ (مغرب اقصیٰ کے مورخ کا راہ نما) مولف: عبدالسلام بن سُودہ

تقطیع متوسط۔ کاغذ، طباعت اعلیٰ۔ ۵۵۴ صفحے۔ مطبوعہ: تطوان (۱۳۶۹ھ/۱۹۵۰ء)

مراکش (جسے مغرب اقصیٰ بھی کہتے ہیں) کی تاریخ پر یہ کتاب اچھا مسالہ فراہم کرتی ہے لائق مؤلف نے اس میں اُن تمام کتابوں کا تعارف کرایا ہے جن میں مراکش کی تاریخ، جغرافیہ یا اس کی نمایاں شخصیتوں اور خانوادوں وغیرہ سے متعلق مواد مل سکتا ہے۔ ترتیب موضوع کے اعتبار سے ہے اور آٹھ مختلف ابواب کے تحت یہ جواہر ریزے جمع کیے گئے ہیں۔ کتاب ہر لحاظ سے مفید اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

کتاب معہد مولای الحسن کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ تطوان (مراکش کے اسپینی منطقہ کا صدر مقام) میں یہ ادارہ ایک عرصہ سے علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے اور اس کے نگراں سید ی عبداللہ کنون حسنی ایڈیٹر "لسان الدین" کی عنایت سے اس کی مطبوعات کبھی کبھی ہماری نظر سے بھی گذر جاتی ہیں۔ شروع میں عبداللہ کنون کا پیش لفظ اور مصنف کی طرف سے منظوم "اھداء" ہے جس میں سلطان مراکش کی علمی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ ایک عالم ابوعبداللہ محمد العابد الفاسی الفہری کے قلم سے مقدمہ بھی ہے۔ ان سب کے بعد مصنف کا اپنا مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تبویب اور اصطلاحات کے متعلق اپنے طریق تدوین کی توضیح کی ہے۔

(۶) عقیدۃ المسلم (مسلمان کا عقیدہ): مصنف: محمد الغزالی۔ تقطیع متوسط۔ طباعت اعلیٰ۔ کاغذ معمولی ۱۸۲ صفحے۔ مطبوعہ: قاہرہ ۱۹۵۱ء۔

عقائد پر محمد الغزالی کی یہ کتاب مدرسوں کی دنیا میں انقلابی کہی جاسکتی ہے۔ ہمارے عربی مدرسوں میں عقائد پر جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، ان سے ذہن میں صفائی اور روشنی پیدا ہونے کے بجائے الجھاؤ اور جمود پیدا ہوتا ہے۔ پوری شرح عقائد نسفی پڑھ جایئے، شاید ہی کتاب و سنت سے کہیں کوئی استدلال نظر آئے گا۔ یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ عقائد پر کتاب لکھی جائے اور اس میں کتاب اللہ ہی کے سرچشمہ سے اکتساب فیض نہ کیا جائے۔ دنیا بدل گئی، علمائے سلف کی کتابیں چھپ چھپ کر عام ہو چکیں، مگر ہمارے مدرسے اب تک اشعری علم کلام ہی کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ محمد الغزالی (جو ازہر کے عالم اور حلقۂ اخوان کے ایک ممتاز صاحب قلم ہیں)

نے زیر نظر کتاب لکھ کر یہ کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انہوں نے الوہیت، نبوت اور معاد تین اصولی چیزوں تک گفتگو محدود رکھی ہے۔ انداز بحث دل نشیں اور موجودہ ذہن و دماغ سے مناسبت رکھتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر بحث میں کتاب اللہ سے استدلال و استنباط خاص خصوصیت ہے۔

توحید کے باب میں مصنف کا بیان بے لچک ہے۔ توسل کی خار دار وادی سے بھی دامن بچا کر نکل گئے ہیں۔ کہیں کہیں کمزوری معلوم ہوتی ہے، مگر نتیجہ میں محققین علماء سے متفق ہیں (ص ۵۵-۵۶)۔ مصنف عمل کو ایمان کی اساس بتاتے ہیں اور اس میں سخت ہیں۔ تارک صلوٰۃ کو مرتد قرار دیتے ہیں (ص ۱۰۴) اور یہ وہ مقام ہے، جہاں راقم بھی گھبرا اٹھتا ہے اور بات بنائے نہیں بن پڑتی۔ عمل کے باب میں مصنف کی سختی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ بے عمل کو منافق قرار دیتے ہیں (ص ۱۱۱)۔ اس قسم کے ایک بے عمل موروثی مسلمان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"میرے علم میں ایک شہر میں کپڑے کے دو کارخانے ہیں۔ ایک کا مالک غیر مسلم ہے۔ وہ تعصب کے الزام سے ڈر کر جمعہ کے دن مزدوروں کو نماز کی چھٹی دے دیتا ہے۔ دوسرے کا مالک موروثی (مسلم بالوراثت) مسلمان ہے، وہ اپنے اس نام نہاد اسلام کی وجہ سے بے باک ہے۔ اور اپنے مزدوروں کو نماز کی چھٹی نہیں دیتا۔ اس سے کچھ کہو، تو نماز اور نمازیوں کو ہزار صلواتیں سنانا شروع کر دے گا۔ کیا اس طرح کے کمینے (دو نمبر) مومنین کے شمار میں آسکتے ہیں؟ (ص ۱۱۱)"

کتاب ہر حیثیت سے مفید ہے۔ کاش! ہمارے عربی مدرسوں میں داخل نصاب ہو سکتی۔

(۷) تذکرۃ الدعاۃ (داعیوں کا ہدایت نامہ)۔ مصنف: البہی الخولی، بڑی تقطیع، ۳۱۰ صفحے۔ طباعت اعلیٰ، کاغذ متوسط۔ مطبوعہ قاہرہ: ۱۹۵۱ء۔

البہی الخولی بڑے صالح، سنجیدہ اور صاحب فکر مصنف و ادیب ہیں۔ محمد الغزالی اور عبدالعزیز کامل کی طرح ان کا شمار بھی اخوان کے خاص اصحاب فکر و علم میں ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اپنے رفقائے دعوت کی تربیت کے لیے لکھی ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن خود حسن البناء مرحوم کے "پیش لفظ" کے ساتھ ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس دوسرے اڈیشن میں بھی مرحوم کے چند تعارفی جملے تبرک کے طور پر آغاز میں درج ہیں۔ کتاب

بہت جامع اور ایک داعی کی تمام ضروریات و فرائض سے بحث کرتی ہے۔ کتاب پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوا کہ ان کے خیالات سلجھے ہوئے ہیں اور طرز فکر میں ژولیدگی نہیں پائی جاتی۔ تزکیہ و تبلیغ، اور طہارت قلب و روح پر مختلف حیثیتوں سے دلنشین بحثیں ہیں۔ ایسی متنوع کتاب کا کہیں سے اقتباس دینا ذرا مشکل ہے۔ اس لیے ہم یہاں اپنی اجمالی اور عام رائے پر بس کرتے ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ اسلامی تحریک کے علم بردار، جہاں بھی ہوں، اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی اور اپنے رفیقوں کی تربیت میں اس سے مدد لیں۔

(۸) فقہ السنۃ (جلد اول)۔ مولف: السید سابق۔ چھوٹی کتابی تقطیع، ۳۲۰ صفحے، طباعت و کاغذ اعلیٰ۔ مطبوعہ: قاہرہ ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۰ء

یہ کتاب حدیث و فقہ کا مجموعہ ہے۔ ترتیب فقہی ابواب کی ہے، مگر استدلال کی بنیاد یکسر حدیث پر ہے۔ مصنف نے سادہ اور عام فہم انداز میں فقہی مسائل بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ "فقہی مسائل" سے عام فقہی کتابوں کی طرف ذہن منتقل نہ ہو۔ مصنف نے بحث و تحقیق میں صرف حدیث پر اعتماد کیا ہے۔ "نقل مذاہب" بھی کرتے ہیں، مگر کسی ایک فقہی مذہب کے پابند نہیں معلوم ہوتے۔ کہیں ایک مسلک کو دوسرے پر ترجیح بھی دیتے ہیں جیسے رفع یدین کے باب میں خاصی مدلل بحث کے بعد جمہور ائمہ کے مذہب کو ترجیح دی ہے (ص ۲۵۱-۲۴۹)۔ اسی طرح قرأۃ خلف الامام میں حنفیہ اور شافعیہ کے بین بین ابن تیمیہ کے مسلک کی تائید کی ہے (ص ۲۸۰)۔ تارک صلوٰۃ کی تکفیر کے بارے میں غیر جانبدار رہنے کی کوشش کی ہے، مگر آخر میں شوکانی کا قول نقل کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید مولف کا رجحان اسی طرف ہے۔ شوکانی کی تفصیلی رائے کے لیے ملاحظہ ہو، نیل الاوطار (ج ۱ ص ۲۵۴-۲۵۶)۔

حدیث و فقہ کے مبتدی طالب علم کے لیے یہ کتاب ہمیں بہت مفید معلوم ہوئی۔ ہمارے سامنے پہلی جلد کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے اکثر ابواب آگئے ہیں۔ اس کی دو جلدیں اور چھپ چکی ہیں۔ تیسری ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ شروع میں حسن البنا مرحوم کا ایک مختصر پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد مولف کا پُر مغز مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے دین کے مقصد اور اسلامی فقہ پر گفتگو کی ہے۔ "خلافیات" میں ان کے افکار بہت سلجھے ہوئے اور صاف ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ

اخوان کی دعوت میں جو دو چار ازہر کے عالم کھنچ کر آتے ہیں، وہ سب روشن خیال اور روادار ہیں۔

محمد الغزالی کی "عقیدۃ المسلم" کی طرح یہ کتاب بھی اس لائق ہے کہ ہمارے مدرسوں کے نصاب میں داخل ہو۔

(۹) الاسلام واوضاعنا القانونیہ (اسلام اور ہماری قانونی تشکیلات) مصنف: عبدالقادر عودہ۔ تقطیع متوسط، ۱۱۹ صفحے۔ طباعت اچھی۔ کاغذ معمولی۔ مطبوعہ: قاہرہ ۱۹۵۱ء

اس کتاب کے مصنف عبدالقادر عودہ، ایک برس پہلے تک مصر میں جج تھے اور اب ملازمت سے الگ ہونے کے بعد اخوان کے نائب مرشد منتخب ہوئے ہیں۔ غالباً وکالت بھی کرتے ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی اور حیرت انگیز تبدیلی یہ ہے کہ دو تین سالوں میں انہوں نے ایسی قیمتی کتابیں لکھ ڈالیں، جو دوسرے سالہا سال میں نہیں لکھ سکتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی اور اہم علمی کتاب (التشریع الجنائی الاسلامی) کا تعارف تو ہم کسی دوسری فرصت میں کرائیں گے۔ آج کی صحبت میں ان کی تین چھوٹی کتابوں کا سرسری ذکر کرنا ہے۔ اس سے ان کے رجحان فکر و نظر کا اندازہ ہو جائے گا۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے مصر کے رائج قانونی نظام کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے اس کی تالیف کے دوران میں وہ اپنے منصب قضا پر فائز تھے، اس لیے مقدمہ ہی میں اپنی حیثیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید یہ سوال پیدا ہو کہ ایک جج کے لیے ملک کے قانونی نظام پر نکتہ چینی کرنا کہاں تک درست ہے؟ اس کے جواب میں عبدالقادر عودہ کہتے ہیں:-

"میں جج ہوں، لیکن مسلمان ہوں (انا قاض ولکنی مسلم)" ص ۹

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ "ایک مسلمان جج اپنے منصب پر ہوتے ہوئے ہر چیز کو چھوڑ سکتا ہے، لیکن اسلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔" (ص ۱۱-۹)

موجودہ قانونی نظام کے مقابلے میں اپنی پوزیشن واضح کرنے کے بعد مصنف نے تفصیلی تنقید کر کے بتایا ہے کہ موجودہ سسٹم مصر کے حالات اور اس کے باشندوں کی قومی خصوصیات سے بالکل میل نہیں کھاتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے موجودہ قانون کی بے اعتدالیاں کھول کھول کر نمایاں کی ہیں۔

مسلمان حکومتوں (جنہیں عام رواج کے مطابق مصنف الحکومات الاسلامیہ ہی کہتے ہیں) پر

بھی سخت تنقید کی ہے، اور ان کے حکمرانوں کو ان کی اسلام دشمنی اور اسلام سے ناواقفیت پر سخت ملامت کی ہے (ص۸۵ تا ۱۰۱)۔ اسلام کے اجتماعی نظام کی بھی مولف نے مفصل تشریح کی ہے۔ ان کی رائے میں اسلامی نظام کے اہم ارکان بارہ ہیں:۔

(۱) کامل مساوات (۲) بے لچک عدل (۳) حریت (حریت عقیدہ، حریت فکر، حریت اظہار رائے) (۴) اخوت (۵) اتحاد (۶) تعاون (۷) برائیوں سے بچنا (۸) خوبیوں کو اختیار کرنا (۹) بندہ اللہ کی ملک میں امین ہے، حقیقی مالک نہیں۔ اس کی حیثیت مستخلف کی ہے (۱۰) دولت کی تقسیم (۱۱) صلہ رحمی (۱۲) شوریٰ ص۹۳

ان بارہ عنوانوں کے تحت جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے ہمارے ہاں کے اسلامی حلقے اچھی طرح مانوس ہیں۔ خوشی ہے کہ اب مصر میں بھی یہ باتیں بار بار کہی جارہی ہیں اور مختلف پیرایوں میں، گو کہیں کہیں عمق تفکیر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

کتاب کی زبان عام اخباری سطح سے بلند نہیں۔ مصنف اس میدان میں ابھی نئے نئے آئے ہیں۔ توقع ہے کہ جلدی ہی ان کی زبان بھی بلند ہو جائے گی۔

(۱۰) الأسلام واوضاعنا السیاسیة (اسلام اور ہمارا سیاسی نظام) مصنف: عبدالقادر عودہ۔ تقطیع متوسط۔ طباعت اچھی، کاغذ معمولی۔ ۲۲۵ صفحے۔ مطبوعہ: قاہرہ ۱۹۵۱ء

یہ عبدالقادر عودہ کی دوسری کتاب ہے۔ یوں تو اس کا موضوع بحث بہت وسیع ہے، مگر اس میں موجودہ سیاسی نظام پر تنقید یا اس کے ساتھ تقابل بہت کم کیا گیا ہے۔ البتہ اسلام کے سیاسی نظام پر ایک حد تک مفصل اور معلومات افزا گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے اہم ابواب یہ ہیں:

(۱) استخلاف فی الارض (۲) مال سب اللہ کا ہے (۳) حکم اور امر اللہ ہی کے لیے خاص ہیں۔ (للہ الحکم والامر)۔ (۴) اسلامی حکومت کے فرائض اور خصوصیات (۵) خلافت اور امامت کبریٰ (۶) خلیفہ یا امام کی حیثیت (۷) شوریٰ (۸) اسلامی حکومت میں اقتدار (۹) ہمارے موجودہ نظام کو اسلام سے کیا نسبت ہے؟ (۱۰) اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟

جہاں تک مصنف کی فکر اور ذہن کا تعلق ہے، اس میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ اور اسلام کے سیاسی نظام

کو وہ ٹھیک ٹھیک سمجھے ہیں اور اس کی اچھی اور واضح تشریح کی ہے۔ کمیونزم اور جمہوریت سے اسلام کا مقابلہ کرنے والوں کے مصنف بہت شاکی ہیں (ص ۷-۲۱۶)۔ خلافت و امامت اور انعقاد بیعت کی بحثیں انہوں نے متقدمین سے مستعار لی ہیں، اس لیے کتاب میں بعض ایسی تفصیلات بھی آگئی ہیں، جن کی اس زمانے میں ضرورت نہیں پڑتی۔ خلافت کے لیے "قرشیت" کی شرط اور اس کی تردید (ص ۱۰۹، ۱۰۴) ایک امام کی شرط (ص ۱۰۰) ایک اسٹیٹ (ص ۶-۱۶۵) اور مسلمان ایک قوم ہیں (ص ۲۰۸-۲۰۲)، یہ اور اس قسم کی بحثیں پرانی ہو چکیں۔

مصنف نے بعض مختلف فیہ مسائل میں کسی ایک پہلو کو ترجیح بھی دی ہے۔ امام کے انتخاب میں وہ اہل حل و عقد، کی اکثریت کا اتفاق کافی سمجھتے ہیں (ص ۱۱۱، ۱۱۶، ۱۶۸)۔ شوریٰ میں اکثریت کی رائے بہرحال فیصلہ کن ہوگی (ص ۱۵۰)۔ کسی اعلیٰ منصب کی طلب مکروہ ہے، حرام نہیں (ص ۹-۱۶۸)۔ یہ سب مسئلے اجتہادی ہیں اور ان میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، اور انہیں برداشت کرنا چاہیے۔ خود راقم کا رجحان بھی مصنف سے زیادہ مختلف نہیں۔ البتہ جہاں مولف نے خلافت کا منصب مدت العمر ہی کے لیے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس پر اجماع سے دلیل لائے ہیں (ص ۱۳۸)، اس سے عاجز کو اختلاف ہے۔ اس کی حمایت میں کوئی نص نہیں۔ صرف خلافت راشدہ کے 'تعامل' کو اجماع نہیں کہہ سکتے۔ پھر خود اجماع اپنی جگہ پر بڑا متنازع فیہ مسئلہ ہے۔ ایک اچھا خاصہ طبقہ بکیسر اجماع کا منکر ہے۔ اور جو قائل ہیں، ان کے ہاں بھی بڑی شرطیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں بھی دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ اور اس کا فیصلہ مصالح وقت کے تحت ہوگا۔

ہمارے کچھ دوست قرآن کریم میں بعض انبیاء کے ساتھ "ملک" کا لفظ دیکھ کر بدکتے ہیں۔ اور بعض دوسرے خوش فہم اسے اپنی محبوب "ملوکیت" کے حق میں دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم پر اس سے بڑا ظلم نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے اس مشکل کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خلیفہ، امام اور ملک کو ہم معنی قرار دیتے ہیں (ص ۶۸، ۷)، کبھی مُستخلَف کو بھی 'ملک' کہتے ہیں (ص ۱۵)۔ کتاب میں اور بھی اچھی بحثیں ہیں۔ کسی صاحب علم کے ہر حرف اور ہر جزئیہ سے اتفاق تو ذرا دشوار ہے۔ البتہ

اجمالی طور پر ہم مصنف کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں۔

آخر میں علمائے کرام کو خوب جھنجھوڑا ہے اور انہیں غیرت دلائی ہے۔ مگر یہاں تو "لو نادیت حیًّا" کا معاملہ ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۱۱) الاسلام بین جھل ابنائہ و عجز علمائہ (مسلمانوں کی جہالت اور علماء کی بے بسی کے درمیان اسلام کا حال)۔ عبد القادر عودہ۔ چھوٹی تقطیع، ۸۰ صفحے۔ کاغذ معمولی، طباعت اعلیٰ مطبوعہ: قاہرہ ۱۹۵۱ء۔

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں مصنف نے مسلمانوں کی عام جہالت اور تعلیم یافتہ لوگوں کی دین سے ناواقفیت کا رونا رویا ہے۔ مصنف کے مذاق کے لحاظ سے کتاب پر "قانونی پہلو" غالب ہے یعنی انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی قانون کامل اور موجودہ زمانے کی ضروریات کو اچھی طرح پورا کرتا ہے۔ آخر میں علماء سے اپیل کی ہے کہ وہ خواب سے بیدار ہوں اور نئی پود کو دین سے بیگانہ نہ ہونے دیں۔

★ پاکستان کے جواں ہمت، اسلام پسند طلباء کی آواز،
★ اسلامی انقلاب کی صدائے بازگشت
★ طلباء کے حقوق کا محافظ و ترجمان

پندرہ روزہ اسٹوڈنٹس وائس STUDENT'S VOICE

(زیر نگرانی: اسلامی جمعیت طلبہ کراچی)

جولائی ۵۲ء کے پہلے ہفتے سے منظرِ عام پر آگیا ہے

قیمت فی پرچہ ۱؍ (یہ پرچہ ۸ صفحات پر مشتمل ہوگا) سالانہ چندہ ۲۴ شماروں کے لیے ۴؍

خط و کتابت کا پتہ:- $\frac{12}{18}$، بندر روڈ، مقابل وائی، ڈبلیو۔ سی۔ اے کراچی